ضرورتِ رسالت

مولوی محمد اکرم شاہ صاحب

برادرانِ ملت قبل ازیں کہ میں اصلی عنوان کے متعلق کچھ تبصرہ کروں تمہیداً ان اعتراضات کا جواب دینا مناسب سمجھتا ہوں جو کہ اس سنت الٰہی (یعنی ارسال رسل) پر کئے جاتے ہیں حضرات اس دورِ حاضرہ میں کہ جس میں تہذیب و تمدن کا عام چرچا ہے اور بے دینی اور باطل پرستی اور دہریت اور زندیقیت زوروں پر ہے اور ہر فرد و بشر مرد و زن پیر و جوان غریب و امیر ترقی اور عزت کا متلاشی ہے اور ہر ایک نئی روشنی اور قومی تہذیب کا ایک مکمل پیکر اور اس کا من کل الوجوہ حامی ہونے کا کوشاں ہے غرضکہ خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم ہر ایک اسی رو میں بہا جاتا ہے نہ مذہب سے واسطہ ہے اور نہ دین کی تلاش ہے، نہ خدا کا ڈر ہے نہ آخرت پر نظر۔ ایسے نازک زمانہ میں کہ جس میں ان حضرات کی طرف سے جو کہ مغربی تہذیب و معاشرت میں سرتاپا ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور مذہب اور دین سے بالکل ایک طرف نکل چکے ہیں اور دہریت اور بے دینی کے بے پناہ سیلاب میں بہہ چکے ہیں جس طرح دیگر اصولِ اسلامیہ اور قوانینِ الٰہیہ پر طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اور قرآن حمید کی تعلیم پر اپنی نامعقولی اور بے سمجھی کی بنا پر قسم قسم کی موشگافیاں اور گستاخیاں اور لچر شبہات پیش کرتے ہیں منجملہ ان کے ایک مسئلہ رسالت بھی ہے آج بعض حضرات کی طرف سے نہایت ہی بے باکی اور جرأت کے ساتھ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب عقلِ انسانی ایک ایسا معیار اور ایسی کسوٹی ہے کہ جس سے انسان ہر ایک چیز کی کنہ اور حقیقت معلوم کر سکتا ہے تو جس طرح مادیات اور مخلوقات اور ممکنات کا ادراک عقل سے ہونا کوئی محال امر نہیں ہے اسی طرح مجردات اور خالق اور واجب کا ادراک اور اس کی حقیقت کا علم بھی کوئی بعید اور محال بات نہیں ہے تو کیا وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری کیا گیا، ان کے آنے کی غرض جب محض معرفت باری کرانا تھی تو یہ تو ہر ذی عقل اپنی عقل سے کر سکتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس کے لئے پیغمبر بھیجنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی لیکن میں ان حضرات کو چند الزامی اور تحقیقی جواب دیکر ان کے اس باطل ظن کی تردید کرنا چاہتا ہوں اور بتلانا چاہتا ہوں کہ آپ کا یہ اعتراض آپ کی بے علمی اور عدم تفکر کی صریح دلیل ہے۔

اوّلاً الزامی جواب دیتا ہوا میں ان سے دریافت کرتا ہوں کہ جب آپ نے عقل کو ہی ہر شے معلوم کرنے کے لئے معیار قرار دیا ہے تو جملہ اشیاء میں سے خود عقل بھی ایک شے ہے تو مذکورہ معیار کے ماتحت عقل کو نفس عقل کا بھی علم ضروری ہوا تو ہم ان حضرات سے دریافت کرتے ہیں کہ آپ نے جو اپنی عقل سے اپنی عقل کو

معلوم کیا ہے تو ذرا اُس معلوم عقل کی حقیقت بیان فرمادیں۔ یقیناً وہ اس کے بتانے سے عاجز ہوں گے۔ پھر میں ان حضرات سے دریافت کرتا ہوں کہ ایک بچہ جو ابھی اپنی مہربان والدہ کی پیاری گود میں ایام طفولیت گذارتا ہو اور حوادثات زمانہ سے بالکل بے خبر اور لاپروا ہو اور دنیا و مافیہا سے بالکل بے بہرہ اور مستغنی ہو جس کی قوتِ حیات صرف مشفق والدہ کے چند دودھ کے گھونٹ ہوں ایسی حالت میں اور ایسے لاعلمی اور تاریک زمانہ میں اس کے مہربان والد کا دستِ شفقت اس کے سر پر پھر نا بند ہو جائے اب وہ یتیم بچہ کا یتیمی تاریک و تنگ کوٹھری میں پرورش پانا شروع ہو جائے آخر ایک وقت ایسا بھی آجائے کہ وہ اس یتیمی کی ٹھوکروں سے اس مربی حقیقی کی عنایت سے اور اس مربیہ مجازی (یعنی والدہ) کی جدوجہد سے عالم شباب میں قدم رکھتا ہے۔ رب العالمین نے اسے ہر ایک قسم کے انعام سے نوازا ہوا ہے جسمانی صحت بھی عطا کر رکھی ہے اور روحانی حالت بھی صحیح ہے علم اور عقل اور دانائی و فہم بھی حد درجے کا عطا فرما رکھا ہے غرضیکہ ہر مرض سے تندرست ہے لیکن ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے اور خاصکر حد درجہ کا عاقل اور دانا ہونے کے باوجود اگر ہم اس سے پوچھیں کہ بھئی تمہارا باپ کون ہے اس کا کیا نام ہے اس کی شکل کیسی ہے رنگ کیسا ہے قد کتنا ہے اور اس کی عمر کتنی ہے تو بتایئے کہ یہ بالغ عاقل لڑکا ان سوالوں کا جواب دے سکتا ہے ہرگز ہرگز نہیں ہاں اگر اس کے درمیان اور اس کے باپ کی معرفت کے درمیان اسکی والدہ یا کوئی دیگر خویش و قریبی واسطہ ہو اور اسے بتائے کہ تیرا باپ فلاں تھا یہ اس کا نام تھا ایسا اس کا رنگ تھا اور اتنے قد کا تھا اور اتنی عمر رکھتا تھا تو پھر اس بتانے کے بعد یہ بلا جھجک کے تمام باتوں کا جواب دیدیگا تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ باپ کی معرفت کے لئے عقل کافی نہیں بلکہ کسی دوسرے واسطہ کی ضرورت ہے تو بتایئے اور غور کیجئے کہ جب مادیات اور ممکنات میں یہ حالت ہے کہ عقل ان کے ادراک سے قاصر ہے اور کسی واسطہ کی محتاج ہے تو وہ ذات جو کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ کے حجاب میں محجوب ہے اور انسانی طاقت سے باہر ہے اور وہم خیال اور قیاس و گمان سے بالاتر ہے۔ جیسا کہ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم	وز ہرچہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر	ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

اس کا ادراک کس طرح عقل کر سکتی ہے اور اس کی ذات عالی کس قدر اس حادث انسان کی جو کہ خود معدوم ہونے والا ہے اس کی عقل کے ادراک میں سما سکتی ہے اور ایک ممکن کس طرح واجب کی حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے اور ایک حادث کیونکر قدیم کا عالم بالکنہ ہو سکتا ہے تو اس ثانی الزامی جواب کے ضمن میں تحقیقی جواب کی طرف بھی اشارہ ہو گیا وہ کیسے؟ وہ اس طرح کہ جب مادیات مجردات اور نور محض کا ادراک نہیں کر سکتیں اور جب حادث اور ممکن واجب اور قدیم کا عالم بالکنہ نہیں ہو سکتیں اور جب مخلوق خالق کی ذات پر کسی طرح بھی واقف نہیں ہو سکتی

تو اب لازمی اور ضروری ہے کہ کوئی ایسی ذات اور کوئی ایسا وسیلہ ہو جو کہ نہ تو محض مادی اور ظلماتی ہو اور نہ ہی صرف نور محض ہو بلکہ من وجہ مادی ہو اور من وجہ نور ہو جو کہ مادیات کی سختی کو بھی برداشت کرے اور نورِ حق کی تجلیات کا بھی متحمل ہو اور مادی اور نوری کے درمیان اور خالق اور مخلوق کے مابین ان کے آپس میں تعلق جوڑنے کا ذریعہ اور واسطہ بنے اور مخلوق کو خالق کی معرفت کرانے میں معاون اور مدد ہو۔ پس وہ ذریعہ اور وہ واسطہ جو ہوا کرتا ہے اسی کو شرعی اصطلاح میں رسول اور نبی سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اب میں اصل مقصود کی طرف رجوع ہوتا ہوں میں آپ کو بتلاؤں گا کہ آیا نبی نوع انسان کے لئے انبیاء علیہم السلام کا آنا ضروری ہے یا کہ نہیں اور اللہ جل شانہ نے جو یہ سلسلہ ابتدائے آفرینش سے لیکر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل جاری رکھا اس میں کیا فائدہ تھا۔

برادرانِ اسلام اللہ عزوجل نے جس روز سے نوع انسانی کی تخلیق کی ہے اسی دن سے یہ سلسلہ بھی یکے بعد دیگرے جاری رکھا اور انسان کی اصلاح کا مکمل انتظام فرمایا حتیٰ کہ پہلی وہ ہستی جو نوع انسان سے اس دارِ فانی میں نمودار ہوئی وہ نبی ہی تھی یعنی ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام۔ انسان کی اصلاح کے دو پہلو اور دو حصے ہیں اس کی اصلاح ان دو ہی حصوں میں منحصر ہے۔ پہلا حصہ اعتقاد ہے اور دوسرا اصلاح عمل۔ ان دونوں میں سے اصلاح اعتقاد اہم اور ضروری ہے اس لئے یہ مقدم ہے کیونکہ اعتقاد موقوف علیہ ہے اور عمل موقوف تو جب تک موقوف علیہ کی درستی اور اصلاح نہ ہو تب تک موقوف کی اصلاح ناممکن ہے۔ یا یوں کہئے کہ اعتقاد بمنزلہ اصل کے ہے اور عمل بمنزلہ فرع کے تو ظاہر بات ہے کہ جب اصل ہی خراب ہوگا اور اس کی صحت اور درستی نہ ہوگی فرع کس طرح درست اور صحیح ہو سکتی ہے مثلاً ایک شخص ہے جس کا اعتقاد ہے کہ خدا تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی ایسی ذات ہے جو قابل پرستش اور جو نفع و نقصان پہنچا سکتی ہے تو بتائیے اس کی عبادت میں کس طرح خلوص آسکتا ہے اور اس کی یہ عبادت اور یہ تمام عمل کس طرح خالص لوجہ اللہ ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ جس کی بنا پر اصلاحِ اعتقاد مقدم اور اہم ہے اور یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی نبی دنیا میں مبعوث نہیں ہوا جس نے اصلاح اعتقاد کو مقدم نہ کیا ہو۔ مسائل اعتقادیہ میں زیادہ اہم اور مہتم بالشان جو کہ قائم مقام اصول کے ہیں تین مسئلے ہیں۔ توحید[۱] یعنی باری تعالیٰ کے وحدہ لاشریک ہونے کا اعتقاد رکھنا۔ رسالت[۲] یعنی تمام رسولوں کو سچا اور برحق سمجھنا۔ مجازات[۳] یعنی اعمال پر جزا اور سزا ملنے کا معتقد اور قائل ہونا اور یوم حساب کو برحق تسلیم کرنا اگر آپ نظرِ عمیق سے قرآن کا ملاحظہ کریں تو آپ اکثر اور بیشتر اس کا حصان تینوں مسئلوں کی وضاحت میں پائیں گے۔

اب چونکہ میرا اصل مقصد ضرورت رسالت بیان کرنا ہے توحید اور مجازات نہیں اسلئے میں اصل عنوان کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور اولاً تین مقدمے تمہیداً ذکر کرتا ہوں تاکہ اصل مطلب کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہو۔

پہلا مقدمہ۔ ہر ذی عقل اور فہم سلیم رکھنے والے انسان پہ یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ بندے پر اللہ عزوجل کی رضا جوئی اور خوشنودی فرض اور ضروری ہے دلیل اس کی یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ خالق اور رزاق ہے اور انسان مخلوق اور مرزوق ہے۔ اللہ تعالیٰ مالک ہے اور وہ مملوک، باری تعالیٰ حاکم ہے اور انسان محکوم اور واجب تعالیٰ محبوب ہے اور یہ محب ہے۔ ظاہر ہے کہ مخلوق پر خالق کی رضا جوئی فرض ہے اور مرزوق پر رازق کی رضا جوئی اور خوشنودی واجب ہے اور مملوک پر مالک کی خوشنودی اور رضا جوئی ضروری ہے اور محکوم پر حاکم کی اطاعت اور رضا جوئی لازمی ہے اور محب کا محبوب کی رضا جوئی میں مر مٹنا ہی عاشقوں کا عین شیوہ ہے اور خصوصاً جب محبوب بھی ایسا جو کہ دنیا بھر کے تمام محبوب اس کے دستِ نگر ہوں۔ ان میں کی ایک بات کا ہونا بھی رضا جوئی کے فرض ہونے کے لئے ایک بین اور واضح دلیل ہے۔ حالانکہ خداوند قدوس میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں اور ایسے اوصاف ہیں جو کہ انسان کو حق تعالیٰ کی رضا جوئی پر مجبور کرتے ہیں مثلاً بیماری سے شفا دینا اور حاجات کا پورا کرنا اور دیگر مصائب اور آلام سے نجات دینا وغیرہ وغیرہ ان تمام باتوں کا لحاظ کرنے کے بعد کونسا ذی عقل ہے جو اس کا انکار کرے کہ واجب تعالیٰ کی اطاعت اور رضا جوئی فرض نہیں ہے۔ ان مذکورہ باتوں کی طرف قرآنِ کریم میں اکثر مواقع پر تبصرہ کیا گیا۔ (اگر طوالت کا ڈر نہ ہوتا تو ذکر کرتا۔)

دوسرا مقدمہ۔ انسان اپنی عقل اور دانائی سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور غیر رضا جوئی ہرگز معلوم نہیں کر سکتا۔ دلیل اس مقدمہ کی یہ ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کے دل کی بات اور اس کی رضا اور غیر رضا کو بغیر اس کے بتلائے ہوئے معلوم نہیں کر سکتا حالانکہ دونوں ایک دوسرے کو نظر آتے ہیں کیونکہ یہ مادی اور ذی جسم ہیں اور جسم تمام اشیاء سے ظاہر چیز ہے یہانتک کہ ایک دوسرے کو ہاتھ سے ٹٹول کر بھی پکڑ سکتے ہیں مگر باوجود ان تمام باتوں کے ہونے کے پھر بھی ایک انسان دوسرے کی دلی بات اور اس کی رضا اور عدم رضا پر مطلع نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خود نہ بتلائے۔ خواہ اس کے سینے سے سینہ ملالے خواہ اس کے دل کو چیر کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے حتیٰ کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے اور ذرے ذرے کر کے اسے چبا جائے تب بھی اس کی دلی بات پر اور اس کی رضا اور عدم رضا سے واقف نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ خود نہ بتلائے تو بھلا وہ ذات جو کہ نورِ محض ہے اس کی رضا اور عدم رضا پر انسان جو کہ حادث ہے اور ممکن کس طرح مطلع ہو سکتا ہے اور وہ ذات جو کہ لطیف ہے اور انسانی عقل و گمان سے باہر ہے اور لیس کمثلہ شئی ہے اس کا ادراک اور اس کی رضا اور عدم رضا کو انسان کس طرح معلوم کر سکتا ہے۔ ہاں اس کی رضا اور غیر رضا جب ہی معلوم ہو سکتی ہے جبکہ وہ خود اپنی رضا اور عدم رضا بتلائے۔ اسی کی طرف اس آیۂ کریمہ میں اشارہ ہے ولا یحیطون بشیئ من علمہ الا بما شاء (پ۳ ع۱) ترجمہ۔ موجودات میں سے

کوئی شے اس کے معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطۂ علمی میں نہیں لاسکتی مگر جس قدر وہ چاہے۔ لہذا اسکی رضا وغیر رضا کے معلوم کرنے کے لئے اس کے ارشاد کا انتظار ضروری ہے۔

تیسرا مقدمہ، خداوند تعالی کی عظمت اور شانِ عالی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں ہوگا کہ وہ اپنی رضا اور عدم رضا ہر ایک شخص کو تبلائے اور ہر فرد بشر اور ہر کس و ناکس کو منہ لگائے دلیل اس مقدمہ کی یہ ہے کہ پادشاہانِ دنیا کو دیکھئے کہ ان کو ایک معمولی سی عظمت حاصل ہوتی ہے وہ بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں لیکن پھر بھی اپنی رائے اور رضا اور عدم رضا کی بات اپنی نوع سے بھی براہِ راست نہیں کہہ سکتے حالانکہ ہر طرح سے اتحاد ہے محض معمولی سی فوقیت حاصل ہونے کی وجہ سے ہرگز کسی کو اپنی مرضی اور غیر مرضی پر مطلع کرنا گوارہ نہیں کرتے بلکہ مقربانِ بارگاہ سے کہدیتے ہیں وہ آگے عوام کو سنادیتے ہیں یا اشتہار اور منادی وغیرہ کے ذریعہ سے اعلان کردیتے ہیں تو بھلا وہ ذات جو کہ پادشاہوں کی پادشاہ ہے اور جس کی پادشاہت اور حکومت ازلی اور ابدی اور کوئی محدود اور محیط نہیں بلکہ کلی حکومت ہے وہ دنیا کے عارضی حکمرانوں اور بادشاہوں سے بھی کم ہوگیا کہ اپنی مرضی اور عدم مرضی تبلانے کے لئے ہر کس و ناکس اور ہر نتھو خیرے کو منہ لگائے اور ہر ایک سے باتیں کرتا پھرے ہرگز نہیں بلکہ وہ بھی اپنی مرضی اور غیر مرضی بتلانے کیلئے اپنے حضور اور اپنی بارگاہ کے لئے پہلے مقربین کا انتخاب کریگا اور پھر ان کے ذریعہ سے مخلوق کو اپنی مرضی اور غیر مرضی سے آگاہ کریگا۔ چنانچہ . . . .

ارشاد ہے یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (سورہ نحل پ ۱۴) ترجمہ وہ اللہ فرشتوں کو وحی کے ذریعہ اپنا حکم دیکر اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے نازل فرماتا ہے یعنی انبیا علیہم السلام پر اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (سورہ مومن پارہ ۲۴ ع ۷) ترجمہ۔ وہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے وحی یعنی اپنا حکم نازل فرماتا ہے یعنی ہر کس و ناکس کو منہ نہیں لگاتا بلکہ اپنے حکم کے نازل کرنے کے لئے مقربین کا انتخاب کرتا ہے۔

ان تین مقدموں کو ذہن نشین کرلینے کے بعد ہر ذی عقل اور فہم سلیم رکھنے والا اس نتیجہ پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالی بعض ہستیوں کو اپنی بارگاہِ قدوسی کے تقرب کا شرف عطا فرمانے کے بعد ان کو عام مخلوق تک اپنی رضا اور عدم رضا بتلانے کا ذریعہ اور واسطہ بنائے پس وہ ہستیاں جو اس منصب کے سرانجام دینے کے لئے چُنی جاتی ہیں ان کو اسلامی اصطلاح میں نبی اور رسول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ بندوں پر باری تعالی کی رضا جوئی فرض ہے اور انسان بغیر خدا تعالی کے بتلائے اس کی رضا اور عدم رضا سے واقف نہیں ہوسکتا۔ لہذا خدائے تعالی کا خود بتلانا ضروری ہوا اور وہ چونکہ اپنی عالی شان کی وجہ سے ہر کس و ناکس کو اپنی رضا اور غیر رضا نہیں بتلاسکتا لہذا ضرورت پڑی کہ وہ

چند مقربین کا انتخاب کرے اور ان کے ذریعہ سے عوام کو اور اپنے دیگر بندوں کو بالتفصیل اپنی رضا و غیر رضا پر واقف کرادے ان مقرب ہستیوں کا نام رسول ہوتا ہے۔ اس تقریر سے ثابت ہوگیا کہ رسول کا بھیجنا ضروری تھا اور ان کا آنا انسانی اصلاح کے لئے ایک اہم امر ہے۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ایک جامع اور مکمل قانون جو قیامت تک کے لئے کافی ہے بھیجکر یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

اس کے بعد اس بات کی ضرورت ہے کہ رسولوں کی شخصیت پر کچھ روشنی ڈالی جائے کہ آیا رسول بشر تھے انہیں اور اب یہ سلسلہ کیوں ختم ہوگیا۔ چونکہ مضمون لمبا ہو چکا ہے اس لئے فی الحال اس کو چھوڑتا ہوں اگر زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ آئندہ اس پر کچھ روشنی ڈالونگا۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین ؂

(صفحہ ۱۱ کا بقیہ مضمون) ناظرین کرام! خصوصاً منکرین حدیث غور فرمائیں کہ یہ روایت صحابی رسول نے اسوقت بیان کی جبکہ جملہ اطراف عالم میں اسلام ہی کا بول بالا تھا جبکہ ان کو عراق شام و مصر و خراسان، ایران و سوڈان کی فتوحات میں کہیں ایک جگہ بھی شکست نہیں ہوئی تھی۔ عیسائی مسلمان کا نام ہی سن کر پیچھے ہٹ جایا کرتے تھے۔ اور عقل کبھی باور نہ کر سکتی تھی کہ کسی زمانہ میں یورپین اقوام کی کثرت اور غلبہ ہو جائیگا۔ دنیا کی یہی حالت امام مسلم (بالمتوفی ۲۶۱ھ) کی زندگی تک موجود تھی مگر صحابی روایت کرتا ہے اور امام الحدیث اسے اپنی کتاب میں ایمان و ایقان صحت کے ساتھ درج بھی کر دیتے ہیں۔

آج دنیا دیکھ لے کہ امریکن (جو کہ اپنی اصلی نژاد و نہاد کے اعتبار سے یوروپین ہیں) برطانیہ، فرانس سویڈن، ناروے اور جرمن وغیرہ کی حالت کیا ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ زمانے کے دیگر حالات بھی احادیث میں بالصراحت موجود ہیں مگر یہ مضمون اس قدر تفصیل چاہتا ہے کہ "محدث" کے صفحات میں غالباً گنجائش نہ ہوگی میں اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت محسوس کرتا ہوں مشتے از خروارے پر مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ تاہم امید ہے کہ یہ چند سطور خدا کے فضل و کرم سے عاملین حدیث کے لئے مقوی ایمان اور منکرین حدیث کے لئے غور کا مقام ثابت ہونگی۔

وما علینا الا البلاغ